ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.3, 2024

پاکستانی اردو افسانے میں تہذیبی تشخص: منتخب افسانوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

(Cultural Identity in Pakistani Urdu Short Stories: A Research and Critical Analysis of Selected Stories)

Dr. Assad Mehmood Khan
Associate Professor, Head of Department (Urdu),
Minhaj University Lahore

ڈاکٹر اسد محمود خان
ایسوسی ایٹ پروفیسر، صدر شعبہ اردو
منہاج یونیورسٹی لاہور

Abstract:
The basis of literature, language, and culture is an ongoing influence grounded in the origins and essence of social identity. Dialect and expression embody the core of literature, which plays a crucial role in shaping and examining cultural identity. Literature emerges from deep emotional resonance, influenced by the genuine alignment of feelings and attachments within a structured socio-cultural context. The short tale serves as an artistic medium that encapsulates socio-cultural experiences intertwined with emotion and sentiment, where language, expression, and civilization converge and evolve. The brief narrative clarifies the complexities of social awareness and explores the aspects of cultural consciousness. The dual role makes short story fiction an effective medium for illustrating socio-cultural realities. This study examines the representation of cultural identity in selected Pakistani Urdu short stories, providing insights into their narrative and thematic structures.

Key Words: Cultural Identity, Literature, Culture, Narrative, Expression, Dialect, Socio-Cultural

(مُلَخَّص)

زبان و ادب اور تہذیب کی تشکیلی اساس، معاشرتی تشخص کے منبع و مخرخ سے جڑت کا معاملہ ہے جہاں زبان و بیان، ادب کی حقیقت جب کہ ادب، تہذیبی تشخص کی تشکیل و تلاش میں معاون و مددگار ہوتا ہے۔ تخلیق، داخلی و باطنی کیفیات کے درمیان مچلتے شدتِ احساس سے جنم لیتی ہے جو اپنی تہہ داری اور سلقیہ شعاری میں سماجی و تہذیبی چاشنی رکھتی ہے۔ کہانی، انسانی کیفیات میں بُنی سماجی و تہذیبی پیش کاری کی قبول صورتی ہے جہاں زبان و بیان اور روایات کی تشکیل و تلاش ایک کارِ مداوم ٹھہرتا ہے۔ کہانی ایک طرف سماجی شعور کی گرہیں کھولنے میں مصروف ہُوئی اور دوسری جانب تہذیبی شعور کی گتھیاں سلجھانے میں مشغول رہی۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ سماجی اور تہذیبی حقیقتوں کی پیش کاری کا ایک لطیف ذریعہ بنتا ہے۔ مذکورہ تحقیقی مضمون پاکستانی اردو افسانے میں تہذیبی تشخص کے اظہاریے کی بازیافت میں معاون و مددگار ثابت ہو گا۔

کلیدی الفاظ: زبان، ادب، تہذیب، ثقافتی شناخت، معاشرتی تشخص، تشکیلی اساس، مختصر کہانی، افسانہ

تہذیب کیا ہے اور تہذیب و ادب کا باہمی تعلق کیسا ہے؟ تہذیب اور ادب کا رشتہ انسانیت کی فکری اور ثقافتی ترقی میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔ تہذیب کو ہم کسی بھی معاشرتی یا ثقافتی نظام کی وہ بنیاد سمجھ سکتے ہیں جو فرد کی اخلاقی، ذہنی اور روحانی نشوونما کا باعث بنتا ہے۔ یہ نہ صرف کسی قوم یا معاشرے کی اقدار و روایات کی عکاسی کرتا ہے، بلکہ ان تمام خیالات، نظریات اور احساسات کا مجموعہ بھی ہے جو کسی قوم کے اجتماعی شعور کا حصہ بنتے ہیں۔ ادب، جو کہ تہذیب کا ایک نہایت اہم جزو ہے، اس معاشرتی و ثقافتی حقیقت کو بیان کرتا ہے جو تہذیب کی روح میں چھپی ہوتی ہے۔ ادب کا کام صرف تفریح یا خوشی فراہم کرنا نہیں ہوتا، بلکہ یہ تہذیب کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے خیالات، جذبات اور اقدار کو الفاظ میں ڈھالنا بھی ہے۔ ادب کے ذریعے ہم تہذیب کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس میں چھپے ہوئے انسانیت کے تقاضوں، جذبات اور معاشرتی رشتہ داریوں کو دریافت کرتے ہیں۔ اس تحقیق کا مقصد یہ جاننا ہے کہ کس طرح ادب تہذیب کی ترجمانی کرتا ہے اور تہذیب کی بنیاد پر ادب کی تخلیق کیسے ہوتی ہے۔ اس کے ذریعے ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ تہذیب اور ادب کے مابین یہ رشتہ کس طرح انسان کے اجتماعی شعور کو شکل دیتا ہے اور کس طرح ایک تہذیب ادب کے ذریعے اپنے ثقافتی تشخص کو اجاگر کرتی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی(1) نے تہذیب کو انسانی معاشرتی ارتقا کی اصل قرار دیا ہے، جو ذہنی، تکنیکی اور سماجی و ثقافتی ترقی کو شامل کرتی ہے۔ وہ تہذیب کو ایک متحرک اور تبدیل ہونے والا عمل سمجھتے ہیں جس کے ذریعے معاشرت کی ترقی ہوتی ہے۔ اعظمی ابراہیم (2) تہذیب کو ایک مجموعی تجربہ کے طور پر دیکھتے ہیں، جو ظاہری اور باطنی احساسات سے تشکیل پاتی ہے، اور ان کا کہنا ہے کہ جمالیاتی تخلیقات شعوری یا غیر شعوری اجزائے ترکیبی سے جنم لیتی ہیں اور سماجی اقدار کے طور پر رائج ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر سید عابد حسین (3) تہذیب کو اجتماعی سماجی زندگی کے مجموعی نتیجے کے طور پر دیکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ کسی قوم کے اجتماعی ادارے، اصول، قوانین اور زندگی کا جامع نصب العین تہذیب کہلاتا ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ (4) تہذیب کو ثقافتی دائرے میں رکھتے ہوئے اس کو سماج کی مشترکہ کوششوں اور ہم آہنگی کا نتیجہ سمجھتے ہیں کہ ثقافت ایک مختلف قسم کی ہم آہنگ سرگرمیوں کا نتیجہ ہے، جس کا مقصد صرف خود کو حاصل کرنا ہوتا ہے۔

تہذیب اور ثقافت ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں۔ تہذیب، ایک معاشرتی نظام کی اخلاقی، ذہنی اور روحانی بنیاد ہے جو افراد کے کردار، اصول و قوانین اور زندگی کے عمومی معیار کو ترتیب دیتی ہے۔ اس کے برعکس ثقافت ان تمام روایات، عقائد، فنون، زبان اور اقدار کا مجموعہ ہے جو کسی قوم یا معاشرتی گروہ کی شناخت کی عکاسی کرتی ہیں۔ ثقافت تہذیب کی جیتی جاگتی تصویر ہوتی ہے، جس میں تہذیبی اقدار، اصول اور نظریات عملی طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ دونوں تصورات ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ایک مضبوط سماجی تانے بانے کو تشکیل دیتے ہیں۔ جہاں تہذیب افراد کے اخلاقی و فکری معیار کو بلند کرتی ہے، وہاں ثقافت اس کے اظہار کا ذریعہ بنتی ہے۔ چارلس گرے (5) تہذیب اور ثقافت کے تعلق کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ لفظ کلچر کی وضاحت اس وقت مشکل ہو جاتی ہے جب یہ تہذیب سے بہت گہرا تعلق رکھتا ہو، گویا اسے تہذیب کا حصہ سمجھا جائے۔ جب کہ ڈاکٹر وزیر آغا(6) نے تہذیب کی تفہیم کے لیے کہا کہ کلچر میں نئی قدروں کا عوامی سطح پر قبولیت کا عمل تہذیب کا عمل ہے، جہاں کلچر کی سطح تموج اور جست ہوتی ہے، جبکہ تہذیب کی سطح پھیلاؤ، جذب اور تقلید ہے۔

ایک معاشرت کی ثقافت اس کی تہذیب کا حقیقی عکس ہوتی ہے، جو اس کے فنون، رسم و رواج اور زبان میں واضح طور پر نظر آتی ہے۔ یہ رشتہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ تہذیب اور ثقافت ایک دوسرے کے بغیر اپنی تکمیل نہیں کر سکتے۔ ثقافت تہذیب کی جیتی جاگتی شکل ہے، اور تہذیب ثقافت کے لیے ایک گہرائی اور سمت فراہم کرتی ہے۔ اس تحقیق کا مقصد تہذیب اور ثقافت کے اس پیچیدہ رشتہ کو سمجھنا اور یہ جاننا ہے کہ یہ دونوں کیسے ایک دوسرے کے بغیر غیر مکمل ہیں، اور کس طرح ایک قوم کی شناخت اور بقا میں ان کا اہم کردار ہے۔ برطانوی ادیب ایلن ولسن واٹس (7) نے شدتِ جذبات اور تخلیقی کاوش کو معاشرتی عطا قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ ہمارے سب سے ذاتی خیالات اور جذبات دراصل ہمارے اپنے نہیں ہوتے۔ ہم وہ زبان اور خیالات استعمال کرتے ہیں جو ہم نے تخلیق نہیں کیے، بلکہ وہ ہمیں ہماری سماج نے دیے ہیں۔ درحقیقت ایک ادیب کا مقصد تہذیب کو خود تباہی سے بچانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تہذیب ادب کا قرینہ ہے اور ادب تہذیب کا پہلا زینہ ہے۔ دراصل، ہر قوم ایک خاص تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے، جس میں اس کی معاشرتی روایات، اقدار اور ثقافتی سرمایہ شامل ہوتا ہے۔ وہ قوم جو مسلسل ترقی کی راہ پر گامزن رہتی ہے، وہی تہذیب و تمدن کی بلندیوں تک پہنچتی ہے۔ فرد کے اخلاق، خیالات اور اظہار کا سلیقہ قومی شناخت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے، جو بالآخر ایک ایسی معاشرت کو جنم دیتا ہے جس میں مشترکہ اقدار کی اہمیت ہو۔ قوم، معاشرت اور تہذیب کی ارتقا کے لیے جو بنیادی اقدار مشترک ہیں، وہ براہ راست انسان کے علم، ادب، شعور اور آگاہی سے جڑی ہوتی ہیں، جو ایک ترقی یافتہ اور مہذب معاشرت کے قیام کی راہ ہموار کرتی ہیں۔

کہانی کا افسانوی پیرہن اور پاکستانی اردو افسانے میں تہذیبی تشخص کے اظہاریہ کی صورت کیسی ہے؟ پاکستانی اردو افسانے نے تقسیم کے بعد جس سمت میں قدم بڑھایا، وہ صرف ادب کی ایک نئی تشکیل نہیں بلکہ ایک پوری تہذیبی اور ثقافتی شناخت کی بنیاد بنی۔ یہ افسانے ایک عہد کی عکس بندی کرتے ہیں، جس میں سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کے اثرات گہرے انداز میں نظر آتے ہیں۔ بٹوارے اور فسادات کے بعد، اردو افسانہ ہجرت اور منتقلی کے موضوعات پر مرکوز ہوا، جہاں نقل مکانی کے دکھ اور تہذیبی تشخص کا سوال افسانوں میں جڑ پکڑ گیا۔ فوجی حکومت کے ابتدائی دور نے افسانے کو تجریدی اور علامتی زبان میں ڈھالا، جس میں عالمی سطح پر ہونے والی جنگوں اور ان کے اثرات نے نئی کہانیوں کو جنم دیا۔ جیسے جیسے حالات بدلے، اردو افسانہ بھی ان تبدیلیوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر نئی سمتوں کی طرف بڑھا۔ دہشت گردی کے عالمی اثرات نے ایک نیا منظر نامہ تخلیق کیا، جس نے اردو افسانے میں نئے کردار اور کہانیاں متعارف کرائیں۔ اس تحقیق میں منتخب افسانوں کے ذریعے پاکستانی تہذیبی تشخص اور اس کے اظہاریہ کا تجزیہ کیا جائے گا، جہاں ادب اور ثقافت کے رشتہ کو گہرائی سے سمجھا جائے گا۔

پاکستانی اردو افسانے کے سرخیل سعادت حسن منٹو، اگرچہ خود کو حقیقت نگاری کے لبادہ میں کروٹ لیتی جنسیت کی چھاپ سے جدا نہیں کر پاتے ہیں لیکن ایک حقیقی تخلیق کار اور کہانی کار کا تہذیبی شعور اپنی تہہ داری کئی افسانوں میں بے نقاب کرتا اور پہلی تاثیر مقابل آ جاتا ہے۔ "ساڑھے تین آنے" میں کریم ملی کافی کی پیالی؛ "آخری سلیوٹ" میں دریائے کشن گنگا کنارے موجود مظفر آباد کو جاتی سڑک پر گندی گندی گالیوں کی گونج؛ "پیرن" کی شلوار قمیص، چست پاجامے، ساڑھی،

فراک، بیڈنگ کاسٹیوم اور فینسی ڈریس میں موجود تصویریں؛"سرکنڈوں کے پیچھے" ڈنڈ پیلتا، مگدر گھماتا، نہ سگریٹ، نہ شراب، اچھے ہندوستانی کھانوں کا شوقین "بلونت سنگھ مجیٹھیا" کا نیل کٹر سے ناخن کی نوک پلک سنوارنا؛ "آنکھیں" کی اندھیری رات میں چمکتی موٹر کار کی ہیڈ لائٹس، ہسپتال کا کیوژوالٹی اور ایکس رے ڈیپارٹمنٹ، سکریننگ میں صحت مند چھاتیاں اور دھڑکتا ہُوا دل؛ دوسری جانب "ٹوبہ ٹیک سنگھ" میں پاکستان زندہ باد کی گونج اور مٹی سے محبت کی کہانی دراصل منٹو کی وطن سے محبت اور مٹی سے عقیدت کی کہانی ہے جہاں تہذیبی شعور کی لہریں دیکھی اور محسوس کی جاسکتی ہیں۔

"نیا قانون" کا منگو کوچوان ایک عہد تانگے پر لے کر نکلتا ہے جہاں ایک مکمل تہذیب کی تبدیلی کی خواہش اور تعبیر کا منظر نامہ بنتا دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر نگار عظیم (8) افسانے کی تہذیبی تفہیم بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ "نیا قانون" ایک ایسا افسانہ ہے جو اپنے نئے موضوعات، ماحول کی عکاسی، جزئیات نگاری اور گہری فکری بصیرت کے سبب ہمیشہ کے لیے زندہ رہنے والا اثاثہ بن چکا ہے۔ یہ نہ صرف اس دور کی سیاسی جدوجہد کی عکاسی کرتا ہے بلکہ عوام کی معصومیت، مظلومیت اور محرومیت کی آواز بھی بن جاتا ہے۔ اردو ادب میں "منگو کوچوان" کا کردار ہمیشہ یاد رکھا جائے گا، جو اس افسانے کے ذریعے نہ صرف ایک معاشرتی حقیقت کی نمائندگی کرتا ہے، بلکہ ایک ایسے عہد کی حقیقت کو بھی بے نقاب کرتا ہے جس میں انسانیت کی معصوم آہٹوں کو سنا جاسکتا ہے۔ یہ افسانہ ہماری سیاسی جدوجہد کے دور کا عکس ہے، جہاں ہماری آرزوئیں، امنگیں، تمنائیں اور ناکامیاں ایک صاف منظر کی طرح ظاہر ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ فنی معیار کے لحاظ سے بھی ایک کامیاب افسانہ ہے، جو نہ صرف اپنے عہد کی حقیقتوں کو بیان کرتا ہے بلکہ ادب کے حوالے سے بھی ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہر جزو ہماری اجتماعی جدوجہد اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے جذبات کی گہری عکاسی کرتا ہے۔

افسانہ نگار غلام عباس نے کم لکھا لیکن جو لکھا وہ زیادہ سے بہتر لکھا، اُن کے افسانوں میں موضوعاتی تنوع، سیاسی آگہی، معاشرتی جرٔت اور تہذیبی شعور بدرجہ اتم موجود ہے۔ "اوور کوٹ" کا خوش پوش نوجوان، تراش خراش سے فیشن ایبل، لمبی لمبی قلمیں، چمکتے بال، باریک مونچھیں گویا سرمے کی سلائی سے بنائی گئی، بادامی رنگ کا گرم اوور کوٹ جس کے کاج میں اَٹکا شربتی رنگ گلاب کا ایک اَدھ کھلا پھول، سر پر ایک خاص انداز سے ٹیڑھی رکھی سبز فلیٹ ہیٹ، گلے کے گرد لپٹا ہوا سفید سلک کا گلوبند ، ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں، دوسرے میں بید کی ایک چھوٹی چھڑی جسے کبھی کبھی مزے میں آکے گھمانے لگتا تھا؛ "کتبہ" میں دفتر کے مختلف کلرکوں کی ٹولیوں کی تصویر کشی کی گئی ہے، جن کی وضع قطع اور حیثیت میں تنوع ہے۔ یہ کلرک مختلف لباسوں اور انداز میں دکھائے گئے ہیں: سائیکل سوار، آدھی آستینوں والی قمیص، خاکی زین کے نیکر، چپل، سولا ہیٹ، رنگدار چشمہ، بیڑی منہ میں، اور فائلوں کے گٹھے دبائے ہوئے، جو دفتر کے شور شرابے میں الجھ جانے والی گتھیوں کے حل کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ گھر واپس پہنچتے ہی وہ ان فائلوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور اگلے دن یہ بوجھ پھر سے دفتر لے آتے ہیں۔ "بہروپیا" میں سماج کے مختلف روپ اور اس کے چھپے ہوئے بھیدوں کی منظر کشی کی گئی ہے۔ کبھی خاکی کوٹ پتلون میں ملبوس، چمڑے کا تھیلا گلے میں ڈالے، تو کبھی جٹادھاری سادھو بنے، لنگوٹ کسے ہوئے، جسم پر بھبوت رمائے، ہاتھ میں چمٹا پکڑے، یا پھر سرخ لہنگے میں لڑتی، بھڑتی بھٹکتی بھنگن کی صورت میں دکھائے گئے ہیں۔ یہاں تخلیقی رموز کی گرہیں کھولتے ہوئے، معاشرت اور تہذیب و تمدن کی پیچیدگیاں بھی واضح کی گئی ہیں، جہاں ایک طرف جدید دور کی چمک دمک ہے تو دوسری طرف اس کی پیچیدہ حقیقتوں کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔

غلام عباس کے افسانوں میں موجود سیاسی و معاشرتی شعور نے جس تخلیقی و تہذیبی بلندی کو چھُوا، اُس بارے ڈاکٹر فرمان فتح پُوری (9) رقمطراز ہیں کہ اُن کے افسانوں میں زبان و بیان کی سادگی یا فکر و خیال کی معمولی سطح کبھی بھی تخلیق کی گہرائی کو متاثر نہیں کر پائی۔ ان کی تخلیقات ہمیشہ اپنے منصب پر قائم رہیں، اور ہر دور میں انہوں نے اپنے افسانوں کو ادبی معیار کی بلندی پر برقرار رکھا۔

"آنندی" میں تخلیقی و تہذیبی شعور کی رو کا ایک انداز ملاحظہ ہو:

> " ہمارے نونہالانِ قوم جو درس گاہوں میں تعلیم پا رہے ہیں اور ان کی آئندہ ترقیوں سے قوم کی امیدیں وابستہ ہیں اور قیاس چاہتا ہے کہ ایک نہ ایک دن قوم کی کشتی کو بھنور سے نکالنے کا سہرا اُنہی کے سر بندھے گا۔"(10)

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں دیہی معاشرت پھلتی پھولتی ملتی ہے جو تخلیقی آنچ پر سماج، ثقافت، تہذیب اور تمدن کی سمت متعین کرنے میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ "کپاس کا پھول" میں گونجنے والی سریلی اذان اور واہ گورو کی قسم، تہذیب کی تاکڑی میں رکھی مذہب اور مہذب بازگشت؛ "الحمد اللہ" کی شخصیت میں جو شان و شوکت تھی، وہ ہر لحاظ سے نمایاں تھی۔ وہ ریشمی خوشابی لنگی اور دو گھوڑا بوسکی کی قمیص میں ملبوس رہتے، جس کے آستینوں کی چنٹیں سینکڑوں کی تعداد میں ہوتی تھیں۔ اودے رنگ کی مخملی واسکٹ میں ایک جیب میں قطب نما رکھا ہوتا اور دوسری جیب میں نسوار کی نرسئی ڈبیہ موجود ہوتی۔ ان کے لباس میں بادامی رنگ کی مشہدی لنگی، مطلا

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.3, 2024

چوٹی والا کلاہ اور گلٹ کے بند بھی شامل تھے۔ ان کا عصا پیتل کے کوکوں سے مزین تھا، اور ان کے بالوں میں استعمال شدہ تیل کی خوشبو گلیوں میں پھیل جاتی، جو ان کی شخصیت کو ایک خاص جاذبیت اور وقار دیتی تھی۔ "گنڈاسا" کا پیر گوڈی، تیل ملے جثے اور ڈھول کی تال، رنگین لنگوٹ، گیوں اور حقوں کے دور، ماضی اور مستقبل کی جانچ پرکھ کا سامان کیے ہُوئے ہے۔ "عالاں" کی ہنرمندی، "ممتا" کی گود میں رکھی دُنیا کی تہذیب، "بابا نور" کا مسجد کی محراب کے پاس رک کر جوتے اتارنا اور ننگے پاؤں آگے بڑھ کر محراب کو ہونٹوں سے چوم کر باری باری دونوں آنکھوں سے لگانا ایک تہذیبی ورثے کی علامت ہے۔

"پرمیشر سنگھ" تہذیبوں کی باہمی جڑت میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کی ترجمانی کرتا ہے:

> "مجھے معاف کر دے اختر، مجھے تمھارے خدا کی قسم میں تمھارا دوست ہوں، تم اکیلے یہاں سے جاؤ گے تو تمھیں کوئی مار دے گا۔ پھر تمھاری ماں پاکستان سے آکر مجھے مارے گی۔ میں خود جا کر تمھیں پاکستان چھوڑ آؤں گا۔ سنا؟ پھر وہاں اگر تمھیں ایک لڑکا مل جائے نا۔ کرتارا نام کا تو تم اسے ادھر گاؤں میں چھوڑ جانا۔ (11)"

ڈاکٹر انوار احمد(12) افسانہ "پرمیشر سنگھ" کے بارے لکھتے ہیں کہ 1947 کے فسادات پر لکھے جانے والے افسانوں میں اگر تین موثر ترین اور فنی اعتبار سے کامیاب افسانے منتخب کیے جائیں تو "پرمیشر سنگھ" ان میں سے ایک اہم افسانہ ہو گا۔ یہ افسانہ نہ صرف فسادات کی ہولناکی اور تباہ کن اثرات کو بیان کرتا ہے، بلکہ اس میں کرداروں کی داخلی کشمکش، ان کی ذہنی اور جذباتی حالتوں کا گہرا تجزیہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ "پرمیشر سنگھ" میں فنی مہارت اور افسانوی تشکیل کی سطح پر جو جاندار حقیقت پسندی اور بے رحمی سے بھرپور تصورات ہیں، وہ اس افسانے کو اردو ادب میں ایک اہم مقام دیتے ہیں۔ اس افسانے کے ذریعے مصنف نے فسادات کے دوران انسانیت کی تذلیل، مذہبی وسماجی تقسیمات اور فرد کے اندر کی تکلیفوں کو نہایت مؤثر اور دل چھولینے والے انداز میں پیش کیا ہے۔

انتظار حسین کی افسانہ نگاری نے علامتی افسانے کو ایک نئی منزل بخشی جہاں انہوں نے تخلیقی فکر و شعور کا ہاتھ پکڑ کر تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی فکر و شعور کی منزل ڈھونڈنے میں کامیاب کوشش کی ہے۔ "زرد کتا"، لومڑی کا بچہ اور کبوتر؛ وضو، قلمدان اور کاغذ، روح اور تہذیب کی تفہیم و تفسیر کا معاملہ ہے؛ "ہمسفر" مسافرت میں لاہور، داتا دربار و رپاکستان؛ "شہر افسوس" میں زندہ رہا اور زندہ ہوں کی تکرار، زندگی اور تہذیب کی خواہش جیسی ہے۔ انتظار حسین کا "آخری آدمی" ہنوز تہذیبوں کی تشکیل و تلاش میں سرگرداں افسانوں کی زمینوں میں محوِ سفر ہے۔ ڈاکٹر فرید حسینی(13)، "انتظار حسین کے افسانوں میں علامت نگاری" کے حوالے سے تہذیبی و تمدنی روایت کا حوالہ یُوں ڈھونڈتے ہیں کہ تہذیب کے خال و خد نکھارنے اور ابھارنے میں انتظار حسین نے جہاں انسانوں، پرندوں، جانوروں اور درختوں کو وسیلہ بنایا، وہیں در و دیوار، گلی کوچے، دریچے و دروازے، کنگرے اور صحن بھی ان کی تخلیقی بصیرت کا حصہ بنے۔ ان عناصر کو انہوں نے صرف ماحول یا منظر کے طور پر نہیں، بلکہ تہذیبی اور ثقافتی تناظر میں گہرے مفاہیم کی حامل اشیاء کے طور پر پیش کیا۔ ان کی کہانیوں میں یہ تمام چیزیں محض سجاوٹ یا پس منظر نہیں ہوتیں، بلکہ وہ کرداروں کے جذبات اور داخلی کیفیات کی عکاسی کرتی ہیں۔ انتظار حسین کا فن یہ ظاہر کرتا ہے کہ تہذیب محض ایک سماجی یا ثقافتی ڈھانچہ نہیں، بلکہ وہ ہمارے روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی چیزوں اور ہمارے ماحول میں جیتی جاگتی حقیقتوں میں بھی سانس لیتی ہے۔

بانو قدسیہ، کی افسانہ نگاری میں معاشرت کا پہلو، اُن کی تخلیقی و تہذیبی فکر و شعور کی عملی تربیت کا مظہر ٹھہرتی ہے۔ بانو قدسیہ نے زبان و بیان، کہانی اور کہانی کاری، افسانہ اور افسانہ نگاری کی ترویج کے ساتھ سماج، معاشرہ، رشتے، روایات اور تہذیب و تمدن کی ترویج کا بھی اہتمام کیا ہے۔ "توبہ شکن" کی توبہ اور تھپڑوں کی گونج؛ "یہ رشتہ و پیوند" میں جاری اردو کی کلاس اور دیوانِ غالب پر رکھی انگشتِ شہادت؛ "ذات کا محاسبہ" میں تہذیبوں کی تفہیم کے درمیان جاگتی مٹی، دھرتی اور وطن کی محبت ---پاکستان؛ "انتر ہوت اداسی" میں کتی اور گشتی کی چیخ نے گلی محلے میں جنسی روایات کا دَر وَا کیا ہے۔ "نیو ورلڈ آرڈر" میں لفظوں کی ترتیب و تقسیم کی تہذیب توجہ طلب ٹھہرتی ہے:

> "ہاں بھئی ہاں! یاد آیا۔ اس کا ایکسپوژر ضرور ہو۔ کنوئیں کا مینڈک نہ ہو اپنے ہی گن گانے والا۔۔۔ بلکہ اگر ہو سکے تو انٹرنیشنل لیول کا ایکسپوژر ہو۔ بھلا ایسے آدمی کا بھی کیا فائدہ جو کراس کلچر نہ جانتا ہو۔ "(14)

بانو قدسیہ نے اپنے افسانوں میں جو الفاظ اور تصورات استعمال کیے ہیں، وہ سماج اور معاشرت کی گہرائیوں سے اخذ کیے گئے ہیں، جس کی وجہ سے ان کی تخلیقات میں ایک عمیق حقیقت پسندی اور عصری ماحول کی جھلک محسوس ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں میں انسانی نفسیات کی پیچیدگیاں، جذباتی اتار چڑھاؤ اور داخلی کشمکش

اس انداز میں پیش کی گئی ہیں کہ قاری ایک الگ ہی دنیا میں کھو جاتا ہے۔ ان کا بیانیہ نہ صرف کہانی کے کرداروں کی زندگیوں کو زندہ کرتا ہے بلکہ انسانی تجربات کی پیچیدگیوں کو اتنی مہارت سے بیان کرتا ہے کہ ہر لفظ ایک نیا منظر تخلیق کرتا ہے اور قاری کو گہرے فکری اور جذباتی ربط میں جکڑ لیتا ہے۔

نئے افسانہ نگاروں میں سید زبیر شاہ، کے افسانے ارضیت اور مقامیت کی بحث سے آگے کا معاملہ ہے جہاں تخلیقی فکر و شعور، تہذیبی فکر و شعور کا ماتھا چومنے آتا ہے۔ یُوں بھی مقامیت کا شعور، اجتماعیت کا رنگ نکالنے میں اپنا کردار ادا کر سکتا ہے اور کرتا بھی ہے۔ سید زبیر شاہ کا افسانہ، مقامی روایات کی انگلی پکڑ کر تہذیب و تمدن کی سمت سفر آغاز کرتا اور ایک عالمی منظر نامے کی کہانی سے جڑتا ہُوا دکھائی دیتا ہے۔ "فصیلِ شب کے پار" شام کے سناٹوں میں گم شاداب خیل قبیلہ کی روایات، اسلحہ سے لیس بوڑھے اور تجدید عہد کی روشنی میں جاگتے زرک خیل قبیلہ کی خواہشات؛ "ہائبر نیشن" میں ہُوئی پانچویں واردات مخالف احتجاج میں شامل ایک کہانی کار؛ "سر د صحرا کی پیاس" میں گم رشتوں کا احساس اور پیار؛ "ہجومِ مرگ میں زندگی" اور گولیوں کی ٹرتڑاہٹ، سورج کے گلے میں پڑا، ستاروں کی زنجیر کا پھندا؛ "کفارہ" میں مٹی کی محبت کا احساس، وطنیت اور تہذیب کو گرہیں کھولتے دکھائی دیتی ہیں۔ "قربانی جو رائیگاں گئی" میں ہمارے معاشرتی روایات کا حسن، خاندانی رشتے اور محبت کا اظہار کچھ یُوں سماج کا معاملہ سلجھاتا ہے:

> "وہ مٹی کے چھوٹے چھوٹے گھروندے بناتی رہی اور اجمل شاہ دور سے دوڑتا ہُوا آتا اور گرا دیتا۔ ایک بار جب اُس نے بہن کی گڑیا اُٹھا کر تندور میں پھینکی تو وہ رونے لگی، مگر جب ماں نے اجمل شاہ کو ڈانٹتے ہُوئے اُسے مارنے کے لیے قدم بڑھائے تو وہ خود اُسے لے کر گھر سے باہر بھاگ گئی، پھر جب یہ بڑے ہوئے تو اسی بھائی کی زندگی بچانے کی خاطر، وہ خود کو موت کے ریلے میں بہانے پر بھی آمادہ ہو گئی تھی۔"(15)

رابعہ الربا، کی افسانہ نگار عہدِ حاضر کی تخلیقی، تہذیبی، سیاسی، نفسیاتی ضروریات کی تاثیر کا حاصل لگتی ہیں جہاں تازہ کہانی اپنے خود خال کو سنوارنے کے لیے نئے کرداروں اور نئی ضرورتوں کو پُورا کرتی دکھائی دیتی ہے۔ رابعہ کی کہانیوں میں تخلیقی فکر و شعور کی جست، زمانوں اور زمینوں کا احاطہ کرتی دکھائی دیتی ہے۔ "ساتویں سمت" روح کی تلاش اور تہجد کا تارا، کہانی کا سفر، کہانی کار کی مسافرت، ایک سات سمندر پار کی شہرت، ایک فسانہ، ایک ناول شیڈوز برنٹ؛ "روح کا سفر" کھوجتی تخلیقی فکر و شعور کی تاریں، آسمانی پردوں پر رائل بلیو لہریں؛ غزل کا مطلع، انا الحق کا نعرہ؛ کعبہ کا طواف، مدینہ کی زمین ایک تہذیب کا سفر کھولتی دکھائی دیتی ہے۔ "دستخط" سے نکلی عورت کی عزت اور محبت کا معاملہ، زمینداروں کی مذہبی روایات کا سلسلہ؛ عالیشان ہوٹل میں بجتی دھیمی موسیقی اور خوابی روشنیوں کا طلسم معاشرت کی گتھی سلجھانے کی کوشش میں ہے۔

رابعہ کا افسانہ " کاموفلیگ " میں معاشرتی روایات میں گوندھی تہذیب و تمدن کی گرہیں کھلتی ہیں اور کھلتی جاتی ہیں:

> "ہمارا خاندان مشترکہ خاندانی نظام کا ایک حصہ تھا اور چاندنی راتوں میں باتیں داستانوں کی صورت اختیار کر لیا کرتی تھیں۔ ایسی ہی ایک چاندنی رات کو سارا گھرانا چھت پر اکٹھا تھا۔ سب بڑے بوڑھے ایک طرف اپنا گروہ بنائے چارپائیوں پر بیٹھے تھے اور ماضی کو یاد کر رہے تھے اور دوسری طرف ماموں ہم سب کزنز کو لے کر کہاوتوں اور حکایتوں سے نواز رہے تھے۔"(16)

تہذیبی شعور، تخلیقی ادب اور تہذیبی تشخص کی تلاش و تشکیل کا حاصل کیا ہے؟ کہانی، سماج کے خمیر سے جنم لیتی، روایات کی انگلی پکڑ کر تخلیقی فکر و شعور کی زمینوں پر چلتی اور سیاسی، معاشی اور نفسیاتی نقشین تربیت پر آگے بڑھتی ہُوئی دکھائی دیتی ہر قوم کی تہذیب ہے۔ کہانی کا افسانوی پیرہن اور پاکستانی اردو افسانے میں تہذیبی تشخص کے اظہاریہ کی صورت نئی منزلوں کی سمت سفر کا معاملہ ہے جہاں پاکستانی افسانہ نگار، اپنے کرداروں کی انگلی پکڑے تہذیبی فکر و شعور کی جانب سفر میں ہیں۔ کسی بھی معاشرت میں مٹی سے محبت، باہمی وابستگی، تعلق و رشتہ داری کی گوندھی بندھی معراجِ کیف کو تہذیب کہا جائے گا۔ باہمی جڑت کی خوبی، افراد اور فکر و شعور کی قربت داری کا سبب ٹھہرتی ہے جہاں رسوم جنم لیتی اور روایات پھلتی پھولتی ہیں۔ موجودہ صدی، زمینی و زمانی، علاقائی و مذہبی، تقریری و تحریری، تہذیبی و تمدنی ضرورت سے نکل کر عالمی و مجموعی، سیاسی و معاشی، علمی و فکری تعلق داری کی جانب سفر بڑھا چکی ہے جس کی سبب تخلیقی فکر و شعور اور تہذیبی فکر و شعور میں کئی نئی صورتیں جنم لے چکی اور کئی نئے مباحث نے جگہ بنالی ہے۔ تہذیبی مباحث کی تازہ کاری نے عالمی تہذیبی ورثہ کی بنیاد رکھ دی ہے جس کی اہمیت سے انکار نہیں اور نہ ہی اردو زبان و بیان کی جنم بھومی پر اثرات سے اجتناب ممکن رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِن مباحث نے جہاں "یک ثقافتی" یا "کثیر ثقافتی" جیسے عنوانات کو متعارف کرایا وہاں "شناخت کے بحران" جیسے موضوع کو زیرِ بحث بھی بنایا ہے۔

تہذیبی تشخص کے مروجہ عملی نظریات میں فعالیاتی نظریہ، تضادیاتی نظریہ اور علامتی نظریہ کے درمیان پھوٹنے والی نئی بحث اور تازہ نظریہ "کلچرل ریلیٹوزم" (Cultural Relativism)، تہذیبی اضافیت، تہذیبی علاقیت یا تہذیبی نسبیت کا نظریہ فعال اور اثر پذیر ہوا ہے۔ ایک فلسفیانہ اندازِ فکر و شعور ہے جس کے مطابق سیاست، معیشت، اخلاق، اقدار، قانون اور حقوق، انفرادی یا اجتماعی کسی بھی مقابل سے برتر یا بدتر نہیں بلکہ مساوی اور برابر ہیں۔ انفرادی شناخت، اجتماعی شناخت کا جزو تو ہو سکتی ہے لیکن کُل کے زیرِ اثر خود کا وجود نہیں کھو سکتی ہے۔ گمان و درجہ تاثیر کا اظہاریہ زبان کی تشکیل کا ذریعہ ہے، یُوں فرد، معاشرہ اور تہذیب جہاں دیگر عناصر کی شناخت بناتے ہیں وہاں زبان کی شناخت بھی بنتی ہے۔ زبان، تہذیب و ثقافت کی نمائندگی، تخلیقی فکر و شعور کی بنیادوں پر قائم کرتی جب کہ تہذیب کی نمائندگی، تمدنی فکر و شعور کی بنیادوں پر قائم ہوتی ہے۔ باہمی تعلق اور جرأت زبان و بیان اور تہذیب و ثقافت کی ترویج کا معاملہ ہے جس میں تعطل شناختی بحران کو آوازہ دیتا ہے۔ اردو زبان، یہاں کی مٹی سے جڑی روایات، تمدن، ثقافت، فنون، اقدار اور تخلیقی اظہاریے کی نمائندہ زبان ہے جو تہذیب و ثقافت تشکیلیت اور ترجمانی کا معاملہ بطریقِ احسن نبھاتی دکھائی دیتی ہے۔ یُوں بلاشبہ مذکورہ بحث کا حاصل تطہیرِ فکر، ذوق اور آداب سے مرصع تخلیقی فکری و شعوری اثاثہ؛ معاشرت، ترقی یافتہ اور مودب روایات سے مرقع تہذیبی فکری و شعوری نتیجہ؛ فکری، ثقافتی اور مادی ترقی کی تشکیلیت؛ سماجی و معاشرتی تنظیم کاری کی صفت و بُنت؛ تمدن، مدنیت، شہر زیستی و شہر نشینی؛ اخلاق، ثقافہ، کادیب و انظباط؛ فرد، قوم اور معاشرہ کی ثقافتی شناخت اور اعلیٰ طرزِ زندگی کی تہذیبی شہادت؛ فنونِ لطیفہ میں انفرادیت اور مہارتِ کاملہ؛ ادب میں پہچان اور بصیرتِ مکالمہ؛ حمد و نعت، نظم، غزل، غزم اور مرثیہ؛ داستان، قصہ، ناول، کہانی اور افسانہ کی زیبائی تہذیبی شعور، تخلیقی ادب اور تہذیبی تشخص کی تلاش و تشکیل کا حاصل ہے۔

حوالہ جات:

(1) جالبی، ڈاکٹر جمیل (1964ء) *پاکستانی کلچر* (اول ایڈیشن)، کراچی، مشتاق بک ڈپو، ص45۔

(2) ابراہیم، اعظمی (2021ء) *فیض احمد فیض کی نظر میں کلچر کیا ہے*، ادبی میراث:- https://adbimiras.com/faiz-ahmad-faiz-ki-nazar-mein-culture-kia-hai-by-ibrahim-azmi/۔

(3) حسین، ڈاکٹر سید عابد (1955ء) *قومی تہذیب کا مسئلہ*، دہلی، انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، ص5۔

(4) Eliot, T. S. (2014). *Notes towards the definition of culture*. Boston: Houghton Mifflin Harcourt. p. 17.

(5) Sha, C. G. (1931). *Trends of civilization and culture*. Woodstock: American Book Company. p. 76.

(6) آغا، ڈاکٹر (2009ء) *کلچر کے خدوخال*، لاہور، مجلس ترقی ادب، ص15۔

(7) Watts, A. W. (2009). *The book: On the taboo against knowing who you are*. London: Souvenir Press Ltd. p. 70.

(8) عظیم، ڈاکٹر نگار (2002ء) *منٹو کا سرمایہ فکر و فن*، دہلی، بزمِ ہم قلم، ص64۔

(9) پُوری، ڈاکٹر فرمان فتح (2000ء) *اردو اور افسانہ نگار*، لاہور، الوقار پبلیشرز، ص109۔

(10) عباس، غلام (2016ء)، "آنندی"، مشمولہ: *"کلیاتِ غلام عباس"*، مرتبہ: احمد، ندیم، کولکتہ، رہروان ادب، ص212۔

(11) قاسمی، احمد ندیم (2007ء)، "پرمیشر"، مشمولہ: *"احمد ندیم قاسمی کے نمائندہ افسانے"*، مرتبہ: پوری، ڈاکٹر اسلم جمشید، دہلی، ماڈرن پبلشنگ ہاوس، ص49۔

(12) احمد، ڈاکٹر انوار (1988ء) *اردو افسانہ: تحقیقی و تنقید*، ملتان، کتاب نگر، ص362۔

(13) حسینی، ڈاکٹر فرید (2020ء) انتظار حسین کے افسانوں میں علامت نگاری، *اردو ریسرچ جرنل*، ص25۔

(14) قدسیہ، بانو (2022ء) *بانو قدسیہ کے افسانے*، ریختہ، https://www.rekhta.org/authors/bano-qudsiya/stories?lang=ur

(15) شاہ، ڈاکٹر زبیر (2017ء) *یخ بستہ دہلیز*، پشاور، اعراف پرنٹرز، ص62۔

(16) الرباء، رابعہ (2022ء) *رابعہ الربا کے افسانے*، ریختہ، https://www.rekhta.org/authors/rabia-al-raba/stories?lang=ur